© rasailojaraid.com

منظور احمد

تعلیم کا مسئلہ

تاریخ فکر اسلامی میں علوم کی تقابلی اہمیت پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ متقدمین اور متوسطین (قرون وسطی) نے کسی علم کے محمود و مذموم ہونے کی جو بحث اٹھائی تھی، وہ آج بھی جاری ہے اور مختلف علوم اپنی افادیت کے اعتبار سے مختلف زمانوں میں آگے پیچھے ہوتے رہتے ہیں۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ علم شے بہ از جہل شے" یعنی ہر علم کوئی نہ کوئی افادیت رکھتا ہے اور اس کے مابین نافع اور غیر نافع کی تقسیم کا نفس علم کی قدر پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ نفع و نقصان اضافی صفات ہیں جو علم کو بحیثیت ایک فی نفسہ قدر کے متاثر نہیں کرتیں۔ اس کے باوجود یہ فکر بھی بجا ہے کہ اگر علم کا زندگی سے گہرا تعلق ہے تو اس کے لیے تحصیل و تدریس علم میں منصوبہ بندی اور انتخاب کا مسئلہ ضرور طے ہونا چاہیے اور ہر زمانے میں علم کی درجہ بندی اس کی افادیت اور منفعت کے لحاظ سے کرنی چاہیے۔

تاریخی اعتبار سے مسلمانوں میں وہ علوم جو ظن و تخمین، توہم پرستی، بے یقینی اور بے عملی پیدا کرتے ہیں، مذموم سمجھے گئے ہیں۔ مستقبل کی ظنی پیشین گوئی کرنے والے علم مثلاً کہانت و فال گیری کو خود قرآن مجید نے ناپسندیدہ قرار دیا ہے۔ اسی طرح وہ علوم جو یقین و ایمان کو ضعف پہنچاتے ہوں یا زندگی کے بارے میں شک اور بے اعتقادی کو جنم دیتے ہوں یا حیات کی ترقی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے تصور کو دھندلا کرتے ہوں وہ نافع نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ سحر و طلسمات جو توہمات پر مبنی ہیں اور کائنات کی ٹھوس قطعی حقیقتوں سے انحراف کرتے ہیں، بجا طور پر علم غیر نافع قرار دیئے گئے ہیں۔

نافع اور غیر نافع، محمود اور مذموم کی اس تفریق میں یہ بات قابل ذکر نظر آتی ہے کہ وہ علوم جن کو غیر نافع قرار دیا گیا ہے، غیر سائنٹفک علوم ہیں یعنی ایسے علوم ہیں جن کی بنیاد انسانی تجربات، عقلی استخراج یا قیاس پر نہ رکھی گئی ہو۔ یہ نکتہ تاریخ علم و دانش میں مغرب کی نشاۃ ثانیہ کے بعد حاصل ہوا۔ اس کی انتہا مغرب میں وگینسٹائن کے فلسفے نے کی جس نے یہ بتلایا کہ ایسے تمام قضیے جن پر صدق اور کذب کا اطلاق نہ ہو سکے، سائنس اور علم کے دائرۂ کار سے باہر ہیں۔ اس کا مطلب یہ نکلا کہ مذہبی عقائد، اخلاقی احکام، جمالیاتی تنقید اور تفہیم، سب علوم کی تعریف سے خارج ہو جاتے ہیں۔

اسلام کے تاریخی پس منظر میں نافع اور غیر نافع کی تقسیم کا معیار مجملاً یہ ہے کہ ایسے تمام علوم جو دنیا اور آخرت میں حسنہ کا موجب ہوں، نافع ہیں اور جو دنیا اور آخرت میں کسی کام نہیں آتے، غیر نافع۔ اس بحث میں اگرچہ بعض ایسے دلچسپ مباحث بھی آسکتے ہیں جو ان علوم کو بھی نافع قرار دے سکیں جو کسی زمانے میں ظنی، قیاسی، سحر اور فال گیری کے زمرے میں آتے تھے۔ میری مراد ان علوم سے ہے جن کے متعلق ابھی تک کوئی سائنٹفک ترازو نہیں بن سکا جیسے E.S.P (فوق حسی ادراک) اور Clairvoyance (غیب بینی)۔ ان کے متعلق یہ کہنا ابھی مشکل ہے کہ کلی طور پر توہمات ہیں، لیکن ان کو فی الوقت کسی سائنسی اصول یا نظریے کے تحت سمجھایا نہیں جاسکتا۔

نافع اور غیر نافع کی سائنسی اور غیر سائنسی تفصیل اگرچہ مفید ہو سکتی ہے اور تاریخ سائنس کے بعض تاریک گوشوں کو روشن کر سکتی ہے، لیکن یہ مسئلہ اس موقع کے لیے غیر متعلق ہوگا۔ اس وقت علم نافع سے مراد یہ ہے کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہم اپنی درس گاہوں میں ایسے علوم کی ترویج کریں جو ہماری ترقی، معاشی خوش حالی اور مبنی بر عدل معاشرے کے لیے ضروری ہیں۔

کسی قوم کی ترقی کی نشان دہی عام طور پر معاشی خوش حالی سے ہوتی ہے اور اس کے معیارات عام اوسط آمدنی، قومی پیداوار وغیرہ ہوتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ معیارات کسی حد تک قوم کی معاشی حالت کی بہتری یا ابتری کی نمائندگی کرتے ہیں، لیکن قوم کی مجموعی خوش حالی یا خیر کے قائم مقام نہیں ہوسکتے۔ اس کا امکان ہے کہ کسی ملک کے یہ معیارات تو نسبتاً کم ہوں، لیکن قوم میں مجموعی طور پر فلاح و خیر اس معاشرے سے زیادہ ہو جہاں یہ معیارات بہت اونچے ہوں۔ معاشروں میں سکھ، طمانیت، دولت کی منصفانہ تقسیم اور عدل و انصاف کے معیارات مغرب کے افادی معاشرتی فلسفے نے وضع نہیں کیے ہیں، اس لیے قوموں کی ترقی جانچنے کے لیے مغربی معیارات یک طرفہ ہیں۔ ورلڈ بینک، آئی ایم ایف اور دوسرے عالمی اداروں کے پاس جو رہنما اصول ہیں اور غیر ترقی یافتہ قوموں کے لیے ترقی اور جمہوریت کے فروغ کے جو فارمولے ہیں، ان کی ناکامی کا سبب یہی یک طرفہ معیارات ہیں۔ ہمیں معاشی ترقی سے متعلق زیادہ وسیع مفہوم کو سامنے رکھنا پڑے گا جس میں انسان کی بحیثیت کل ترقی شامل ہو۔ معاشرے میں چند افراد میں دولت کی ریل پیل، صنعت و حرفت کی ترقی، برآمدات یں اضافے سے ہماری ترقی کے معاشی نشانات تو بلند ہو جاتے ہیں اور ان کو ہونا بھی چاہیے، لیکن اگر یہ طریقہ کار معاشرے کی مجموعی خوش حالی، خیر اور برکت میں اضافہ نہیں کرتے تو ہماری ترقی میں کوئی کمی ضرور رہ جاتی ہے جس کا پورا کرنا ہمارے معاشرے کا فرض ہے۔

اس کلی ترقی یا خوش حالی سے تعلیم کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ یہ تعلق دو سطح پر ہے: اولاً" یہ کہ آپ کیا تعلیم دیں۔ دوم یہ کہ یہ تعلیم کس طرح دیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گویا تعلیم کے مقاصد اور اس کی ساخت، دونوں اس کلی خوش حالی یا کلی ترقی کے تحت آجاتے ہیں۔ اگر آپ کو معاشرے کی کلی ترقی مقصود ہے تو آپ کو تعلیم میں معاشرے کی مادی اور سماجی ضروریات کے ساتھ اس کا بھی خیال رکھنا ہوگا کہ معاشرے کی بلند قدریں کیا ہیں اور وہ کس طرح وجود میں آسکتی ہیں۔ ان اقدار سے میری مراد انسانوں کی ان صفات سے ہے جو معاشرے میں اعلیٰ اخلاقی عمل پیدا کرتی ہیں۔ ضروریات انسان کو خود غرض، لالچی، ظالم استحصال کرنے والا اور خود اپنی زندگی کی بھلائی چاہنے والا بنا دیتی ہیں۔ مادی مقاصد انسانوں کو بالعموم بے ایمانی، عدم رواداری، اپنا کام اپنے مفاد کے لیے کسی بھی حربے کے استعمال کو جائز سمجھنا، دوسروں کی ضروریات اور تکالیف کو نظرانداز کر دینا سکھاتے ہیں۔ تعلیم اگر صرف فوری اور مادی مقاصد کے لیے ہو تو وہ انسان کو انسانیت سکھانے کے بجائے اور اس کو نفسانی خواہشات سے بلند کرنے کے بجائے نفس پرست اور عیش پسند بنا دیتی ہے۔

یہ بااقدار تعلیم کیا ہے؟ پاکستان میں عام طور پر اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ اگر انسان کو مذہب کی تعلیم دے دی جائے تو انسان میں اخلاقی اقدار پیدا ہو جائیں گی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ پاکستان کی درس گاہوں میں اسلام کی لازمی تعلیم کے باوجود ہماری قوم کا اخلاقی معیار پست تر ہوتا جا رہا ہے، بلکہ خود مذہب کے نام پر جو عدم رواداری، تشدد اور کم نظری پیدا ہو رہی ہے وہ اس سے پہلے موجود نہیں تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یا تو ہم صحیح مذہب کی تعلیم نہیں دے رہے ہیں یا پھر تعلیم کے طریق کار میں کوئی نقص ہے۔ یہ طرفہ تماشا ہے کہ بعض اوقات اچھے اخلاق والے عدم رواداری اور تشدد میں برے اخلاق والوں سے سبقت لے جاتے ہیں۔

ہماری دانست میں پاکستان میں مذہبی تعلیم میں دونوں خرابیاں موجود ہیں۔ یعنی مذہب کے نام پر جو کچھ پڑھایا جاتا ہے وہ بھی ناقص ہے اور جس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طرح پڑھایا جاتا ہے وہ بھی غلط۔ نفس مضمون کا تعلق یہ ہے کہ اسلام کو دنیا کی دوسری آئیڈیالوجی کی طرح ایک آئیڈیالوجی بنا دیا گیا ہے اور چوں کہ اس آئیڈیالوجی کے ساتھ حق ہونے کا مطلق تصور موجود ہے' اس لیے اس سے باہر جو کچھ بھی ہے وہ باطل ہے جس کے خلاف جنگ اور جہاد فرض ہے۔ مذہب کی اس طور پر تفہیم انسان کی توجہ ظواہر پر مرکوز کر دیتی ہے۔ اس کی نظر انسان کے نفس کی اصلاح کے بجائے ایک قانون کی ترویج سے زیادہ قریب ہو جاتی ہے۔ اس طرح یہ بات ذہن سے نکل جاتی ہے کہ قانون اصلاح کا ذریعہ نہیں' بلکہ معاشرے میں زیادتیوں کے خلاف ایک حربے کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے انسانی صحت کا دارومدار صحت کے بنیادی اصولوں پر زور دینے کے بجائے صرف دواؤں کے بنانے کو سمجھ لیا جائے۔ دوائیں بیماری کا علاج تو کرسکتی ہیں' وہ صحت کی ضامن نہیں ہوتیں۔

ہمارے معاشرے کو جس اسلامی تعلیم کی ضرورت ہے وہ یہ کہ اس کو انسانی نفس کی اصلاح کی طرف زیادہ توجہ دینی چاہیے اور اسے ان اعلا اقدار کو فروغ دینا چاہیے جو انسانوں کو آپس میں بھائی چارے' رواداری' اخلاق اور ایمان داری سے رہنا سکھائیں' ان کو دوسروں پر ظلم کرنے اور دوسروں کے حقوق غصب کرنے سے روکیں اور تشدد سے بچائیں۔ تشدد اور شقاوت' دونوں اسلامی روح کے منافی ہیں۔ اسلام کا معیار مسجد میں نمازیوں کی تعداد سے نہیں' بلکہ نمازیوں کے انفرادی اور اجتماعی کردار سے ناپنا چاہیے اور اگر اس میں کمی ہو تو سمجھنا چاہیے کہ نماز اور روزے سے رسول کریم ﷺ کے بقول ان کو بھوک اور ظاہری حرکات سے زیادہ کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ قرآن کریم میں بار بار ہر مذہبی عمل کو انسانی اخلاق سے جوڑا گیا ہے اور عبادت کے دو رخ بتائے گئے ہیں۔ واقعی طور پر عبادت انسان کو خدا کے روبرو کرتی ہے اور ظاہری طور پر انسانی اخلاق کو متاثر کرتی ہے۔ گویا انسان کی باطنی ترقی اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے عمل کا ایک جزو لاینفک بن جاتی ہے۔ ایمان کے ساتھ عمل صالح ملا دینے میں بھی یہی مصلحت پوشیدہ ہے۔ جن لوگوں کے قلوب اور اعمال پر یہ نتائج مرتب نہیں ہوتے تو قرآن کے بقول ان کے قلوب ایمان سے خالی ہوتے ہیں۔

طریقہ تعلیم میں خرابی یہ ہے کہ اخلاق ظاہری اور باطنی کی اصلاح اور تزکیہ نفس تقریروں اور عقلی دلائل سے ممکن نہیں ہے۔ ہماری ساری عمر خدا کے وجود اور اسلام کی حقانیت ثابت کرنے میں بیت جاتی ہے اور اس تگ و دو میں ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ بعثت رسولؐ کا مقصود تو اخلاق کی اصلاح تھا۔

ہماری تعلیم میں بنیادی نقص یہ ہے کہ ہم علم نافع کی تعریف اس طرح کرتے ہیں کہ جو علم ہم کو نفع پہنچاتا ہے وہ علم نافع ہے۔ ہم یہ بھول گئے کہ انسان کا نفع اور نقصان سمجھنے کے لیے انسانی ذہن کو بالغ نظری اور وسعت درکار ہوتی ہے۔ وہ صرف معاشیات اور سائنس پڑھنے سے نہیں آتی' بلکہ وہ زندگی کے ان لطیف احساسات کو بیدار کرنے سے آتی ہے جن کی مدد سے انسان ایک دوسرے کے درد اور دکھ سے آشنا ہوتا ہے۔ ہماری کلاسیکی تعلیم میں کم از کم یہ خوبی موجود تھی۔ مجھے بچپن میں اگرچہ احساس نہیں تھا' لیکن اس وقت کی پڑھی ہوئی گلستاں اور بوستاں آج بھی مجھے یاد آتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ انسان کی زندگی میں اپنی ذات کے باہر بھی قدر اور قیمت موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ مذہب کی صحیح تعلیم کے ساتھ ہمارے نصاب تعلیم کا ایک لازمی جزو ایسے مضامین بھی ہونے چاہئیں جو بظاہر نفع بخش نظر نہیں آتے' لیکن وہ انسان کی زندگی پر بڑے گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ تاریخ' جمالیات' لٹریچر' فلسفہ' تاریخ تصورات اور مذہب ایسے علوم کی ذیل میں آتے ہیں جو انسان کو ۱۹ سال کی عمر تک پڑھ لینا چاہئیں۔

ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ۸ سال کی تعلیم کے بعد بچے کے مقدر کا فیصلہ اس کے والدین کر دیتے ہیں کہ یہ ڈاکٹر بنے یا انجینئر یا مینجر اور پھر ہماری ساری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

توجہ اس کو ہماری معاشرتی مشین کا ایک پرزہ بنانے میں لگ جاتی ہے۔ ہماری دانست میں یہ فیصلہ کہ بچہ کیا کرے گا' موخر ہونا چاہیے اور ۱۲ سالہ تعلیم کے بجائے ۱۵ سالہ تعلیم اس کو مختلف النوع مضامین کی دے دینی چاہیے۔ اس سے اس کے دماغ کی وسعت میں اضافہ ہوگا اور وہ جانے گا کہ دنیا میں انجینئر' ڈاکٹر اور مینیجر کے علاوہ اور قسم کے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو بحیثیت مجموعی معاشرے کی خوش حالی کے لیے کار آمد ہوسکتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص یا ایک بڑی تعداد فلسفی' شاعر' تاریخ داں یا مذہب کی ماہر بنے' لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جس معاشرے سے ان لوگوں کی تعداد ایک خاص سطح سے گر جاتی ہے وہ معاشرہ اپنے آپ کو خود نہیں سنبھال سکتا اور اپنے کو دنیا سے در آمد کیے ہوئے تصورات کے حوالے کر دیتا ہے۔

ترقی اس میں ہے کہ ہمارے معاشرے میں ایسے لوگ بھی موجود ہوں جو یہ جانتے ہوں کہ ترقی کسے کہتے ہیں اور ایسے بھی جو اس ترقی کو لانے کا ذریعہ بنیں۔ اگرچہ ذریعہ بننے والے لوگ موجود ہوں' لیکن راہ دکھانے والے نہ ہوں تو معاشرہ اپنی منزل متعین نہیں کر سکے گا۔ دنیا کے ممالک' خاص طور پر وہ جہاں ان مادی طور پر غیر نافع لوگوں کی کمی ہے اور خاص طور پر اسلامی ممالک' اس بے کسی کا شکار ہیں کہ ان کی مہار خود ان کے ہاتھ میں نہیں ہے' بلکہ دنیا کی عقل ان کو جس راہ کی طرف ہانکنا چاہے' ہانک دیتی ہے۔

ترقی کی تعریف میں اگر ہم یہ دو مقاصد شامل کر لیں یعنی ذہن اور دل کی وسعت جو انسانی علوم مثلاً فلسفہ' تاریخ' ادب اور جمالیات پڑھانے سے ہوسکتی ہے اور اعلا اقدار جو مذہب کے پڑھانے سے اس طور پر حاصل ہوسکتی ہیں کہ مذہب کو ایک آئیڈیالوجی یا نظام ظاہری سمجھ کر نہ پڑھایا جائے تو ہماری ترقی کا معیار جامع ہوسکتا ہے اور ہم صحیح معنوں میں تعلیم کو اپنی خوش حالی اور ترقی سے جوڑ سکتے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

معاشی ترقی اور تعلیم کے بارے میں یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ اگرچہ ترقی اور تعلیم میں تعلق ضرور پایا جاتا ہے، لیکن یہ تعلق خود کفیل نہیں ہے یعنی یہ ضروری نہیں کہ تعلیم کا اوسط بڑھنے سے خود بخود معاشی ترقی حاصل ہو جائے گی۔ تعلیم معاشی ترقی کے اسباب میں سے ایک سبب ہے اور جب تک دوسرے اسباب مہیا نہ ہوں، معاشی ترقی ممکن نہیں ہوتی۔ اس وقت بھی غریب ممالک میں بعض جگہ تعلیم کا اوسط زیادہ ہے، لیکن معاشی ترقی میں وہ دنیا میں اب بھی بہت پیچھے ہیں۔ اکثر لوگوں کو یہ پتہ ہے کہ صنعتی انقلاب کے اسباب میں بڑا سبب مغرب میں ایک نئے انتظامی ڈھانچے کا وجود میں آنا تھا۔ علوم اور سائنس نے مدد ضرور کی، لیکن اگر یہ نیا انتظامی ڈھانچہ موجود نہ ہوتا تو مغرب میں صنعتی انقلاب ممکن نہ ہوتا۔

یہاں اس حقیقت کا پیش نظر رہنا ضروری ہے کہ جب تک آپ نظام تعلیم میں مناسب تبدیلیاں نہیں لائیں گے اس وقت تک تعلیم آپ کو ترقی کی راہ پر آگے نہیں بڑھا سکتی، بلکہ اعلا تعلیم اگر خود اپنے مقاصد رکھتی ہو تو وہ بھی پورے نہیں ہوتے۔

ا۔ آج جس ڈھانچے پر اعلا تعلیم کی عمارت کھڑی ہے وہ فرسودہ، بے کار اور اتھارٹی پسند ہے۔ اعلا تعلیم ان قوانین سے کنٹرول ہوتی ہے جو صوبائی مرکزی قانون ساز اسمبلی بناتی ہے۔ ان قوانین پر اگر آپ نظر ڈالیں تو پتہ چلے گا کہ یونی ورسٹیوں کے اختیارات کو بہ بتدریج حکومت میں مرکوز کرتی رہی ہیں۔ جو ادارہ یونی ورسٹیوں میں بااختیار ادارہ ہوتا ہے اس میں حکومت کے نمائندوں کی ایک بڑی تعداد رہتی ہے اور اس میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کا تعلیم سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ عدالت عالیہ کا جج، صوبائی یا قومی اسمبلی کا نمائندہ، عالم، صوبائی سیکرٹری تعلیم، ان میں سے کوئی بھی راست طور پر تعلیم سے تعلق نہیں رکھتا۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ ان میں کوئی خود بھی صحیح معنوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں تعلیم یافتہ ہو۔ اس کے علاوہ بھی جو لوگ سنڈیکیٹ میں نامزد ممبران کے طور پر لیے جاتے ہیں ان کی نامزدگی بھی گورنر سے جو یونی ورسٹیوں کا چانسلر ہوتا ہے، کرائی ہوتی ہے۔ اتھارٹی کی اسی مرکزیت کے خلاف ردعمل کے طور پر سنڈیکیٹ میں اساتذہ کے نمائندے داخل ہوئے جو پروفیسروں، ایسوسی ایٹ و اسسٹنٹ پروفیسروں اور لیکچرار پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی سینیٹ کے ذریعے بھی اساتذہ ہی منتخب ہو کر سنڈیکیٹ میں پہنچ جاتے ہیں۔ اس طرح یونی ورسٹی کی مجاز مجلس عاملہ میں طاقت کے دو قطب قائم ہو جاتے ہیں اور ٹریڈ یونین کی طرح کام کرتے ہیں۔ یونی ورسٹی کی ساری تنظیم اب حکومت کے مقاصد اور اساتذہ کے مفاد کی کھینچ تان سے وابستہ ہو جاتی ہے اور وہ مقاصد جن کے حصول کے لیے یونی ورسٹی قائم کی گئی تھی، نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں اعلا تعلیم کا یہ انتظامی ڈھانچہ نہ صرف یہ کہ ناکافی ہے، بلکہ تعلیم کے لیے نقصان دہ بھی ہے۔ تعلیم اس طرح پورے سماج سے کٹ کر حکومت کے اہل کاروں اور دانش گاہوں کے ملازمین کے درمیان ایک تناؤ کے نظام پر قائم ہوتی ہے اور حکومتی اداروں کی طرح سماجی ضروریات سے بالکل بے خبر ہو جاتی ہے۔ افسر شاہی کے اس نظام کی گرفت پاکستان کی جامعات پر بڑی کڑی ہے۔ جامعات اب معاشرے میں ہونے والی تبدیلیوں کا نہ کوئی اثر قبول کرتی ہیں اور نہ ان کے مسائل کا کوئی حل پیش کرتی ہیں۔ شہروں کا بھی کوئی مفاد جامعات سے وابستہ نہیں ہوتا۔ ہماری رائے میں اس نظام کو بدلنے کی سخت ضرورت ہے اور موجودہ انتظامی اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے اعلا تعلیم کی مجالس انتظامیہ میں مختلف ماہرین کی شمولیت مفید ہو سکتی ہے۔ ساتھ ہی اس مجلس عاملہ کے اختیارات اور فرائض بھی نئے سرے سے متعین کرنے ضروری ہیں۔ روز مرہ کے انتظامی امور میں اختیارات کو یونی ورسٹی کے مختلف اختیاراتی یونٹوں میں بانٹ کر اختیارات کی مرکزیت کو کم کرنا چاہیے۔ فیکلٹی کی سطح پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ڈین کو اور شعبوں کی سطح پر صدور شعبہ کو ایسے بہت سے اختیارات تفویض ہو جانے چاہئیں جو آج کل یا تو وائس چانسلر یا سنڈیکیٹ کو حاصل ہیں۔

یونی ورسٹیوں کے دوسرے تنظیمی ڈھانچوں میں بھی تبدیلیاں لانے کی ضرورت ہے۔ بورڈ آف فیکلٹی، اکیڈمک کونسل، اعلا تعلیم و تحقیق کا بورڈ آج کل کی جامعات کی بڑھتی ہوئی اور مختلف النوع ضروریات کو پورا کرنے سے قاصر ہیں۔ ان سب کو نئے سرے سے منظّم ہونا چاہیے۔ تحقیق کے کام کے لیے ایک کے بجائے کئی کمیٹیوں کی ضرورت ہے اور تحقیقی مقالوں کے لیے بھی ابتدائی خاکے منظور کرنے کے لیے ماہرین کی ایک کمیٹی ہونی چاہیے۔ اس طرح تحقیق کا معیار بلند ہوگا اور ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں تعلیمی سیاست کی دست برد سے محفوظ رہیں گی۔ اصولاً تعلیمی اور تنظیمی فیصلوں کے لیے اختیارات کی مرکزیت کے بجائے ان کی تقسیم ضروری ہے۔ اس کے بعض جگہ کچھ نقصانات بھی ہوسکتے ہیں، لیکن ان کا ازالہ بھی ایک کورٹ آف اپیل کی تشکیل سے ہوسکتا ہے جس کے لیے مناسب رہنما اصول اور قوانین بنائے جاسکتے ہیں۔

یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن کی افادیت اس صورت میں جس میں وہ آج کل چل رہا ہے، مشکوک ہے۔ اس کا اصل کام ایک ایسے معروضی نظام کا وضع کرنا ہونا چاہیے جس کی مدد سے مختلف جامعات اور ان کے مختلف شعبوں کی جانچ ہوسکے۔ ہر سال اس جانچ کے نتیجے ان معیارات کے ساتھ جن پر مبنی یہ جانچ کی گئی ہے، شائع ہونے چاہییں تاکہ لوگوں کو پتہ چل سکے کہ کون سی یونی ورسٹی کتنی اچھی یا بری ہے اور کون کتنا کام کر رہا ہے۔ یونی ورسٹیوں کی مالی امداد کے لیے بھی یہ جانچ کسی حد تک ایک عامل ہونا چاہیے، لیکن اس جانچ کے عمل کو حکومت اور یونی ورسٹیوں کی افسر شاہی سے آزاد ایک ایسا خود مختار ادارہ کرے جو اپنے کو معاشرے یا پارلیمنٹ کے سامنے جواب دہ سمجھے۔ اس وقت یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن وزارت تعلیم کی افسر شاہی کا ایک ضمیمہ ہے اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس میں سوچنے اور اعلا تعلیم کے معیارات کو بلند کرنے کے لیے کوئی خاص منصوبے نہیں ہیں۔ اگر ہیں بھی تو وہ بیورو کریٹک ہیں۔

اعلا تعلیم کی جامعات میں جب تک آزاد تحقیق کی روح بیدار نہیں ہو جاتی، معاشرے پر اس کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا، خاص طور پر ان مضامین میں جن کو انسانی اور معاشرتی علوم کہا جاتا ہے۔ یہ بات دھیان میں رکھنی چاہیے کہ تعلیم اور تبلیغ میں بنیادی فرق ہے۔ ان تعلیمی اداروں کا مقصد کسی خاص نقطہ نظر کی ترویج یا کسی خاص مدرسہ فکر کی تبلیغ کرنا نہیں، بلکہ آزادانہ علمی تحقیق اور تنقید کی فضا قائم کرنا ہے۔ علم کے میدان میں عام حالات سے بھی زیادہ رواداری کی ضرورت ہے۔ خاص سائنسی مضامین میں تحقیق ایک بندھے ٹکے خاکے کی پابند ہو کر رہ گئی ہے۔ اہل علم جانتے ہیں کہ تاریخ، سائنس اور تاریخ کے تصورات میں ارتقا ان بندھے ٹکے خاکوں کو توڑ کر ممکن ہوا ہے۔ بطلیموس سے نیوٹن اور آئین اسٹائن تک کا سفر علمی اداروں کے معمل خانوں میں کسی بندھی ٹکی ریسرچ کا نتیجہ نہیں، بلکہ انسانی فکر کی آزادی اور پرانے قیود کو توڑ کر جدید تر خانوں کی تشکیل پر مبنی ہے۔ اس کے لیے تحقیقی نتائج کی اشاعت اور اس کے انتظام کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ہماری جامعات کے بجٹ ناکافی ہیں۔

متذکرہ بالا تین باتیں اکثر کہی جاتی رہی ہیں، لیکن عام طور پر بات کیا ہونا چاہیے؟ تک محدود رہتی ہے۔ جو کچھ ہونا چاہیے وہ موجودہ ڈھانچے میں رہ کر ممکن نہیں۔ موجودہ ڈھانچے کو صرف وہ ادارہ بدل سکتا ہے جس نے اس کو تشکیل دیا ہے۔ اس ادارے میں یا تو یہ جرات نہیں کہ اس ڈھانچے کو توڑ کر دوسرا بنائے یا اس کو ڈر ہے کہ اس طرح اختیارات اس کے ہاتھ سے چھن کر دوسروں کے ہاتھ میں چلے جائیں گے۔ اس لیے صورت حال بڑی حد تک مایوس کن ہے۔ اس کا ازالہ اسی طرح ممکن ہے کہ ملک کے اہل دانش اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسئلے کو بار بار اٹھاتے رہیں اور وہ متبادل ڈھانچے بھی بناتے رہیں جو موجودہ کا بدل ہوسکتے ہیں۔

یہ بات اعلا تعلیم کی تنظیم سے متعلق تھی۔ اسی قسم کے مسائل ہماری ابتدائی اور ثانوی تعلیم میں بھی موجود ہیں، لیکن اس کے تنظیمی پہلو کا دوسرا رخ تعلیمی درجہ بندی سے بھی ہے۔ یہ درجہ بندی ہماری تعلیمی ساخت کا حصہ ہے اور اس کو بھی تبدیل ہونا چاہیے۔ فی الوقت ہمارا تعلیمی نظام ابتدائی، ثانوی، وسطی اور اعلا، چار درجوں میں تقسیم ہے۔ پہلی سے پانچویں اور کچھ جگہ آٹھویں جماعت تک ابتدائی تعلیم ہے۔ نویں اور دسویں جماعت ثانوی درجہ، گیارھویں اور بارھویں جماعت وسطی درجہ ہے۔ اس کے بعد اعلا تعلیم کے درجات شروع ہوتے ہیں۔ اعلا تعلیم بھی دو خانوں میں بٹی ہوئی ہے۔ زیادہ تر جامعات میں تعلیم ماسٹر کی ڈگری سے شروع ہوتی ہے اور کچھ میں بیچلر آنرز سے۔ صرف B.A درجے کی تعلیم کالجوں میں دی جاتی ہے جو اب زیادہ تر سرکاری ہیں اور انھی مسائل سے دوچار ہیں جن سے خود سرکار دوچار ہے یعنی وسائل کی کمی، سفارش اور بے ایمانی۔ ان مسائل کو چھوڑ کر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا بجائے خود پانچ درجات میں تقسیم شدہ تعلیم کا یہ نظام درست ہے یا اس میں تبدیلی کی ضرورت ہے؟

ابتدائی اور ثانوی تعلیم میں تین بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت ہے:
اولاً نصاب، دوئم طریقہ تعلیم اور سوئم درجہ بندی۔ تفصیل میں جائے بغیر یہاں ان بنیادی باتوں کی طرف اشارہ کافی ہوگا جو فوراً اور لازماً تبدیل ہونی چاہییں۔ ابتدائی درجات کے نصاب میں کئی چیزیں ایسی ہیں جو نصاب کے حجم میں تو اضافہ کرتی ہیں، لیکن بچے کی تعلیم و تربیت نہیں کرپاتیں۔ اس نصابی حجم کو کم کرنے اور کم حجم سے زیادہ کام لینے کی ضرورت ہے۔ دینیات اور زبانوں [illegible]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہم نے ایک مرتبہ اکیڈمک کونسل میں تجویز کیا تھا کہ اسلامیات کو بی اے میں لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھانے کے بجائے کچھ عربی یا فارسی پڑھا دی جائے اور ان کے پڑھانے میں بھی نصابی کتابیں وہ رکھی جائیں جو ہم کو اپنے تاریخی اخلاقی نظام سے روشناس کراتی ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ مذہب کا ایک وسیع تر تصور انسانی ذہن میں پیدا ہوگا۔ میری ابتدائی تعلیم میں گلستاں و بوستاں شامل رہی ہے جو اگرچہ اس وقت پوری طرح سمجھ میں نہیں آتی تھیں، لیکن بچپن کے نقوش نے ذہن کے بند دروازے کھولے اور مجھے کبھی بھی اسلام کو نصابی ذریعے کے تحت پڑھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ اسی طرح زبان اور زبان کے ذریعے جو مضامین پڑھائے جاتے ہیں، ابتدائی جماعتوں میں ان کو یکجا کیا جاسکتا ہے۔ کتابوں کے بجائے بچوں کو اپنی فطری صلاحیتوں کو پہچاننے کے دوسرے مواقع آرٹ، آہنگ، نغمہ، شعر، کھیل کود اور معماتی مسائل کے حل کے ذریعے بہم پہنچائے جاسکتے ہیں۔ اگر کوئی ادارہ یا حکومت اس بارے میں ایک ذمہ دار کمیٹی قائم کرے تو اس نکتے کی باقی تفصیلات یہاں تک کہ مکمل نصاب بھی فراہم کیا جاسکتا ہے۔

ہماری ابتدائی تعلیم کی دوسری خرابی طریقہ تعلیم کی ہے۔ اس میں ضرورت سے زیادہ زور یادداشت پر دیا جاتا ہے۔ بچوں کو ابتداء ہی سے یاد کرنے پر لگا دیا جاتا ہے۔ محض یادداشت پر بھروسہ کرنے سے انسان کند ذہن ہو جاتا ہے۔ اس کو ماضی تو یاد رہتا ہے، لیکن وہ اپنا مستقبل تخلیق کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ اسلامی دنیا میں بڑے اور تخلیقی اذہان پیدا نہ ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے۔ ہماری دینی تعلیم کا تو پورا نظام نصابی کتابوں کے یاد کرنے پر مبنی ہے اور وہ بھی اصل نہیں، بلکہ حواشی۔ ملا نظام الدین نے درس نظامی وضع کر کے اس میں کسی حد تک تبدیلی لانے کی کوشش کی، لیکن وہ بھی حواشی کی جگہ مصنفین کی کتابوں کو پڑھنے تک محدود تھی۔ اپنے ذہن اور اپنی عقل کا استعمال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مدرسے کے نظام سے یکم قلم غائب ہے۔ اسی لیے ہمارے عبقری علما بھی تقلید کی گرفت سے آزاد نہ ہوسکے اور علوم و فنون کی اس تبدیلی میں شامل نہ ہوسکے جو باقی دنیا میں آرہی تھی۔ اسی درسی نظام کا اثر بالواسطہ ہماری ابتدائی تعلیم پر بھی پڑا ہے اور وہ محض یادداشت پر مبنی رہ گئی ہے۔ اس کو فوری طور پر بدلنے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے اساتذہ کی ایک پوری فوج کو تربیت دینی پڑے گی۔ ساتھ ہی ابتدائی تعلیم پر خرچ میں اضافہ کرکے وہ ماحول بھی پیدا کرنے کی ضرورت ہے جس میں بچوں کی تخلیقی صلاحیتیں اجاگر ہوسکیں۔

درجہ بندی اور نصاب ملے جلے ہیں۔ نصاب کے ساتھ اس درجہ بندی کے بدلنے کی بھی ضرورت ہے۔ ہماری تعلیم بہت جلد اختصاص کی طرف چلی جاتی ہے۔ شروع ہی سے وہ چھلنیاں لگادی جاتی ہیں جن سے چھن کر بچے آٹھویں کلاس کے بعد سے ڈاکٹر، انجینئر کے خانوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں اور جو اس میں ناکام ہوتے ہیں اور احساس محرومی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہماری دانست میں بچوں کے لیے ۱۹ سال کی عمر تک کا ایک Integerated نصاب ہونا چاہیے جس میں اگرچہ آخری سالوں میں کچھ تخصیص ضرور ہو، لیکن اس کے باوجود تمام طالب علموں کو کچھ ضروری مضامین پڑھا دینے چاہییں۔ اس وقت سب سے بڑی کمی ان علوم کی ہے جنھیں ہم انسانی علوم کہتے ہیں۔ طالب علم چاہے سائنس پڑھے یا آرٹس، صحیح معنوں میں "تعلیم یافتہ" نہیں ہوگا، اگر اس کے ذہن کی وسعت میں اضافہ نہیں ہوگا۔ یہ اضافہ انسانی علوم سے آتا ہے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اگر یہ کام بچے کے لیے آپ نے ۱۹ سال کی عمر تک کر لیا تو وہ صحیح معنوں میں اس قابل ہوسکے گا کہ اپنے مستقبل کے فیصلے دانش مندی سے کرسکے۔ ۱۹ سال کے بعد کی تعلیم اعلا تعلیم ہونی چاہیے اور موجودہ خانوں کو جو کالج اور یونی ورسٹی کے مابین موجود ہیں، ختم ہو جانا چاہیے۔ ۱۹ سال کے بعد طالب علم جب بی۔ اے کے درجے کی تعلیم میں داخل ہو تو یہ تعلیم اس کو اسی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طرح ملنی چاہیے جس طرح یونی ورسٹی کے طالب علم کو۔

جامعات میں پیسے کی کمی کو دلیل بنا کر یہ کہا جاتا ہے کہ جامعات میں تو صرف اعلا تعلیم ہونی چاہیے اور وہ ایم اے اور پی ایچ ڈی کی تعلیم ہے۔ ہم لوگ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ پیسہ تو کالج کی تعلیم کے لیے بھی آنا ہے۔ اب اگر مفروضہ یہ ہے کہ کالجوں میں کم خرچ سے کم معیار کی تعلیم دے کر طالب علم کے ایک حصے کو جامعہ کی تعلیم سے خارج رکھا جائے تو یہ دلیل علمی لحاظ سے درست نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ جامعات میں صرف ان کو داخل ہونا چاہے جو اعلا تعلیم حاصل کرنے کے اہل ہوں اور اس کے لیے امتحانات کی شرائط رکھی جاسکتی ہیں۔ درجہ بندی کی ساخت میں اس تبدیلی سے تعلیم کے معیار کے مثبت نتائج پیدا ہوسکتے ہیں۔ ۱۹ سالہ تعلیم کے بعد ہی بچہ یہ فیصلہ کرسکتا ہے کہ وہ اعلا تعلیم کی طرف جائے یا پیشہ ورانہ تعلیم کی طرف۔ پیشہ ورانہ تعلیم کے لیے بھی انسانی ذہن میں اسی لچک کی ضرورت ہے جس کی اعلا تعلیم میں۔ ہماری طبی اور انجینئرنگ کی تعلیم کسی حد تک ہم میں پیشہ ورانہ مہارت تو پیدا کر رہی ہے، لیکن تخلیق کے سوتے یہاں پر بھی سوکھ گئے ہیں اور ہماری پیشہ ورانہ جامعات یا کالجوں میں اس پر بالکل توجہ نہیں ہے۔ جو لوگ ملک سے باہر جاتے ہیں وہ بھی اطلاقی مہارت تک محدود ہو جاتے ہیں، کیوں کہ اس میں آمدنی کے ذرائع زیادہ ہیں، لیکن تحقیق کے میدان میں کام نہیں کرپاتے۔ اگرچہ ہمارے جیسے غریب ملک کے لیے یہ بات بھی بڑی ہوگی کہ ہم اس مہارت ہی کو حاصل کرلیں جو ہماری صحت اور صنعت کو چلانے کے لیے ضروری ہے، لیکن غریبی ہی وہ محرک بھی ہوسکتی ہے کہ ہم اپنی مصنوعات میں تخلیقی اپج دکھائیں اور دنیا کے بازار میں اپنی نئی اور زیادہ کارآمد اشیا کی پیداوار سے اپنے لیے جگہ بنالیں۔ مجھے یقین ہے اور میرا تجربہ بھی یہی ہے کہ ہمارے کاریگروں میں وہ بنیادی مہارتیں موجود ہیں جو صنعتی انقلاب برپا کرسکتی ہیں، لیکن ہماری تعلیمی ساخت اور ہمارے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تنظیمی ڈھانچے ہماری راہ میں حائل ہیں۔ اگر کسی طور پر ہم اپنے ان پڑھ کاریگروں کی نئی تنظیم کرسکیں تو یہی لوگ بڑی حد تک ہمیں باہر سے مشینوں کی درآمد سے بے نیاز کرسکتے ہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ معاشی ترقی کے لیے ہماری تعلیمی ساخت کو تبدیل کرنے اور اس کو معاشرتی ضروریات کے پورا کرنے کے قابل بنانے کی ضرورت ہے۔ اس کام کے لیے ہماری حکومت نے کسی زمانے میں P.C.S.I.R بھی بنائی تھی، لیکن وہ بھی اسی بنیادی خرابی کی وجہ سے صنعتی تحقیق میں ایسا کوئی کام نہیں کرسکی جو قابل توجہ ہو۔ ہمارے سائنس داں اپنے معمل خانے میں محصور ہو کر کس طرح صنعت کی تحقیق کرسکتے ہیں؟ کتنے صنعت کاروں نے ان کی تحقیق سے فائدہ اٹھایا اور کیوں نہیں اٹھایا؟

ہماری بڑے عرصے سے خواہش ہے کہ کوئی طالب علم اس پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھے کہ P.C.S.I.R کا تجربہ کیوں ناکام رہا ہے اور یہ کس طور کارآمد ہوسکتا ہے؟ اس کی ناکامی میں بیورکریٹک ساخت، وسائل کی فراہمی، مسائل کا انتخاب اور ریسرچ کے طریق کار میں کس کا کتنا ہاتھ ہے؟ پاکستان کی صنعتی مہارت کس قسم کی ہے اور اس کو کس طرح استعمال کیا جاسکتا ہے؟

اگر کوئی صنعتی تنظیم ایک ریسرچ گرانٹ اس کام کے لیے مختص کرسکے تو یہ کام ہوسکتا ہے جو صنعت اور تعلیمی ادارے، دونوں کے لیے مفید ہوگا۔

© rasailojaraid.com